غیر ملکی اسفار سے کم از کم ایک درجن سفر ناموں کا مسالا تو نکل ہی آتا ہے۔

مسلم کے اب تک شائع ہونے والے سفر ناموں کی تعداد چار ہے،(۱۱) ان میں سے بھی ''کاروانِ حرم'' (۱۹۸۷ء) سفرِ حج کی منظوم قلبی و روحانی واردات ہے۔ ''کشورِ کسریٰ تا سونار دیس'' مسلم صاحب کا پہلا نثری سفر نامہ ہے جو ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ یہ سفر نامہ دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے 'سرزمینِ کسریٰ و بخت نصر' میں ایران، عراق اور بہت ہی اختصار کے ساتھ کویت کے سفری تجربات کا بیان کیا گیا ہے جب کہ دوسرے حصے 'سوہنے سونار دیس میں'، میں مرحوم مشرقی پاکستان اور حالیہ بنگلہ دیش کے چار مختلف اسفار کا پُر نم مگر معروضی تجزیہ تحریر ہوا ہے۔

سرزمینِ کسریٰ کا سفر (۱۹۵۳ء) برصغیر پاک و ہند سے باہر مسلم کا پہلا سفر تھا۔ اگر چہ یہ سفر تجارتی مقاصد کے لیے تھا تاہم بقول مسلم:

''مہم جوئی اور مشکل پسندی میری طبیعت میں تھی، سیرِ جہاں اور سفر میں نئے نئے تجربوں کا شوق بھی تھا۔''(۱۲)

۱۹۵۳ء کا ایران مہم جوئی، مشکل پسندی اور نئے تجربات کے حصول کے لیے انتہائی موزوں تھا۔ ایران ایک طرف سخت ترین بیرونی دباؤ کا شکار تھا، دوسری طرف داخلی حادثاتی انقلابات نے بھی اسے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ تودہ (کمیونسٹ) پارٹی کے وزیرِ اعظم محمد مصدق کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد شاہ اور ایران میں تصادم شدت اختیار کر رہا تھا، استعماری طاقتیں نئے کیل کانٹوں سے لیس، تہذیب اور انسان دوستی کے نام پر، ایران کے گرد اپنا شکنجہ کس رہی تھیں اور صورت یہ تھی کہ ''ایران کی کشتی، ناخدا اور بادبان کے بغیر عین منجدھار میں ہچکولے کھا رہی تھی۔''(۱۳) مصنف نے براہِ راست اِس ساری صورتِ حال کا مشاہدہ کیا، اور ایران کو درپیش مشکلات کا تاریخی شعور کی روشنی میں تجزیہ کیا۔

مسلم صاحب نے پاکستان اور ایران کے باہمی تعلقات پر بھی روشنی ڈالی اور پاکستان کے حوالے سے ایران میں پائی جانے والی غلط فہمیوں اور شکوک کے ازالے کی بھی اپنی سی کوشش کی۔ اِس حوالے سے آیت اللہ کاشانی کے ساتھ ان کا مکالمہ بہت اہمیت رکھتا ہے جہاں مسلم، صبر و تحمل سے ایرانی مذہبی رہنما کے پاکستان مخالف خیالات سنتے ہیں اور اپنی باری پہ تحریکِ پاکستان کا پورا مقدمہ جذباتی مگر مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں اور آخر میں پاکستان کی غیر رسمی سفارت کاری کرتے ہوئے یہ مصرع طرح اُٹھانے کے لیے پیش کر دیتے ہیں:

''جناب ہندوستان بھی اسی دولتِ مشترکہ کا رُکن ہے، اگر وہ آپ کا دوست ہے، تو ہم نے آپ کے ساتھ کیا دشمنی کی ہے۔''(۱۴)

ایران، ڈیڑھ ہزار سال سے مسلم دنیا کی اہم ترین تہذیب رہا ہے۔ یہ سعدی و حافظ، فردوسی و خیام اور جامی و سنائی کی سرزمین ہے،

مصنف کی فکری و تہذیبی تربیت میں ایرانی شعراء و حکماء کا کلیدی ہاتھ ہے، اس لیے اس کا تخیل بار بار اُسے فارسی ادب کے درخشاں دور کی طرف لے جاتا ہے، چشمِ تصور میں مسلسل ڈیڑھ ہزار سالہ ایرانی افکار کی باز آفرینی جاری رہتی ہے۔ وہ ان افکار اور فارسی زبان و ادب کے اُردو پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ بھی لیتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں مصنف نے بجا طور پر فلیش بیک (Flash Back) کی تکنیک استعمال کی ہے۔ وہ حال کے جامِ جم میں جھانکتے ہوئے داستانوی کردار کی طرح ماضی کی سیاحت پر نکل جاتے ہیں۔ حال کا سلسلہ وقتی طور پر موقوف ہو جاتا ہے اور ماضی کا تحرک عروج پر پہنچ جاتا ہے۔ تاہم باز آفرینی کے اس عمل سے مسلم صاحب سحر زدہ نہیں ہوتے بلکہ وہ جدید انسان کی طرح ماضی کے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے، حال کا تجزیہ کرتے ہیں اور اس تجزیے کے دوران مستقبل کا منظر نامہ بھی مرتب ہوتا چلا جاتا ہے۔

مسلم صاحب کے ایران میں قیام کے دوران ہی پاکستانی سفیر غضنفر علی خاں جس طرح ترک سفارت کار کی اہلیہ سلویا کو لے کر فرار ہوئے، یہ داستان ممکن ہے دبستانِ عشق میں معتبر ٹھہرے تاہم پاکستانی سفارت کاری کی تاریخ کا یہ تاریک باب ہے۔ البتہ اخبار کی شہ سرخی ضرور پُر لطف بن گئی۔ 'من غضنفر علی خاں، حالِ سرکار چہ طور است'۔ (۵۱)

عراق میں ع س مسلم کو بغداد، بصرہ، کربلائے معلیٰ اور بابل و نینوا جیسے شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں بھی ان کے پیشِ نظر عام معاشرتی زندگی، جغرافیائی کوائف، کاروباری سرگرمیاں نہیں رہیں بلکہ وہ تہذیبی جڑوں کو کھنگالنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس دوران وہ عراق کو درپیش داخلی و خارجی مسائل پر بھی فکری روشنی ڈالتے رہے۔ بغداد میں مصنف کو شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے مزارِ مبارک پر حاضری دینے کا موقع ملا تاہم صاحبِ مزارؒ سے روحانی فیض کے حصول کے راستے میں قسم قسم کے فقیروں کی کھیپ سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی جو اپنی لن ترانیوں، پُر سوز فریادوں، قبولیتِ تمنا کی بشارتوں کے صلے میں جہاں زائرین کی جیب پہ مقدور بھر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں وہاں اُس روحانی انتکاز سے بھی محروم کر دیتے ہیں جو اس طرح کی زیارت کا اصل مقصد ہوتا ہے۔ غوث الاعظمؒ کے مزار پہ فقیروں کا ہجوم، ان کے تعویز اور جالی کے درمیان چھوٹے بڑے نوٹوں کا انبار، زائرین کے توہمات، آدابِ حاضری سے ناواقفیت یہ سب روّیے مسلم صاحب کو پاکستان میں واقع بزرگانِ دین کے مزارات کے ماحول کی یاد دلاتے ہیں۔ اس ساری فضا کی تصویر کاری بڑی عمدگی سے کی گئی ہے تاہم مسلم قبر پرستی کی مروّجہ روش پہ کڑھتے ہیں اور ایک لمحے کو وقتی کسک، تکلیف دہ احساس میں بدل جاتی ہے:

> ''خیال کی یہ وقتی ٹیس فضول تھی۔ میرے وطن پاکستان میں تو مزاروں کو سجدے ہوتے ہیں، لوگ کسی دروازے میں ایک طرف داخل ہو کر دوسری طرف نکل جانے سے ہی داخلِ جنت ہو سکتے ہیں، عبادت، عمل، حقوق العباد کی بجا آوری اور اسوۂ رسولؐ کی پابندی کی مشکل راہ پر چلنے کی کیا ضرورت ہے۔'' (۶۱)

کربلائے معلیٰ میں حاضری کی کیفیات کا صحیح نقشہ کھینچنا بہت مشکل تھا۔ اس لیے مسلم صاحب نے آنکھوں میں نمی، دل میں جذب و شوق، سینے میں جذبات کا طوفان اور سیلِ خیالات جیسی تراکیب اور جملوں پہ اکتفا کیا تاہم چشمِ تصور نے واقعہ کربلا کے اسباب،

سانحات اور نتائج کو بڑے کرب سے ترتیب دیا ہے۔ حاجت مندوں اور خدام کے روّیے اِس بارگاہ میں بھی مختلف نظر نہیں آتے۔

بابل کے معلق باغات، جن کا شمار عجائباتِ ہفتم میں ہوتا رہا ہے، دیکھنے کی شدید خواہش لیے مسلم صاحب بابل پہنچے، مگر افسوس وہاں باغات تو کجا، اُن کے آثار تک دکھائی نہ دیئے۔ ستم بالائے ستم ''ہاروت و ماروت کا کنواں تو ایک اسطورۂ خرافات''(۷۱) نکلا۔

بنگلہ دیش، جس کا سحر، مسلم صاحب نے پہلی دفعہ اُس وقت محسوس کیا جب اُسے مشرقی پاکستان کہلانے میں کوئی حجاب مانع نہ تھا۔(۸۱) 'سونار دھرتی' تازہ تازہ وصل کی سرشاری اور 'دردِ عشق' کے نشاط آور کیف میں بھیگی ہوئی تھی۔ ممکن ہے لاشعور میں کہیں 'انفرادی شناخت' کی خواہش پلکیں جھپکا رہی ہو تاہم تاریک رات کے ہمدم دیرینہ کی رفاقت، رشتوں کے مضبوط بندھن، اجتماعی جدوجہد پر مبنی طویل سفر اور مشترکہ کامیابی کا حصول جیسے عوامل اس خواہش کو نمو کی اجازت نہیں دیتے تھے..... اپنے دیس کے موسم، رنگ اور پھول پتے کسے اچھے نہیں لگتے، اور دیس بھی جادو دیس..... یعنی بنگال..... ''ہرے بھرے کھیت، محبوب کی کمر کی طرح بل کھاتی ہوئی ندیوں، دریاؤں اور بانس کے بلند و بالا درختوں اور گھنے جنگلوں کی سرزمین..... نغمہ و لَے اور رقص و موسیقی کی سرزمین..... رنگ و بو اور حسنِ فطرت کی ملکوتی سرزمین۔''(۹۱)

آشنائی کا عمل، اجنبیت میں کیونکر بدلا؟ اِس کے محرکات کیا تھے؟ اس کے ذمہ دار کون تھے؟ یہ داستان الگ ہے، لیکن بیت المکرّم کی تاریخی مسجد کے بزرگ خطیب کی آنکھوں میں پھیلتا کاجل، در پردہ کچھ اور کہانی سناتا نظر آتا ہے..... ''وہ بھی آب دیدہ ہو گئے، اُٹھ کر بغل گیر ہوئے، خوب دبا کر گلے ملے اور پیٹھ تھپکتے ہوئے خاموشی سے ایک طرف چل دیئے، جیسے جلدی میں ہوں۔''(۰۲) بنگلہ دیش کا یہ سفر اگرچہ 'تیرہویں ایشیائی کانفرنس برائے ذہنی پسماندگان' میں شرکت کی غرض سے تھا، جس کی تفصیلات مسلم صاحب نے فراہم بھی کیں تاہم قارئین کے لیے دلچسپی کے زیادہ حوالے، بنگلہ دیش میں اُردو اور اُردو ادب، بہاری مصیبت زدگان اور پاکستان مخالف جذبات کی حالیہ صورتِ حال، بنتے ہیں۔ یوں تو ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، شام بارک پوری اور ڈاکٹر کلثوم ابوالبشر جیسی شخصیات کا ہونا اُردو کے لیے غنیمت لگتا ہے تاہم اَمر واقعہ یہ ہے کہ ''اُردو کتب کی نشر و اشاعت کا کوئی انتظام نہیں۔ حتیٰ کہ سارے ڈھاکہ بلکہ بنگلہ دیش میں ایک ہی صاحب ہیں جو کتابت کرتے ہیں اور شاعری بھی۔''(۱۲)

ع س مسلم تحریکِ پاکستان کے متحرک کارکنوں میں رہے ہیں، پاکستان اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہ کسی صورت پاکستان کے نظریاتی دفاع سے دستبردار ہوتے نظر نہیں آتے۔ ایران میں آیت اللہ کاشانی کے ساتھ اُن کے جذباتی مکالمے کا ذِکر ہو چکا، بنگلہ دیش میں بھی اُردو کے شاعر اور دانش ور نوشاد نوری کے پاکستان اور بانیٔ پاکستان مخالف خیالات سن کر مسلم صاحب تڑپ اُٹھتے ہیں اور ان اعتراضات کا جو تفصیلی جواب نوشاد نوری کو فراہم کیا گیا اُس کے ذیلی عنوانات سے آپ کو گفتگو کی سنجیدگی کا اندازہ ہو جائے گا..... 'مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کا ارتقاء'..... 'ہندو مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں'..... 'قائداعظم ناقابلِ فروخت تھے'..... یہاں سفرنامہ کچھ دیر کو معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور مسلم صاحب کی حق گوئی اور بے باکی جو موقع محل کی مصلحتوں سے نا آشنا ہے، اپنے عروج کو پہنچ جاتی

ہے..... ڈاکٹر عبدالستار نیازی کا یہ جملہ سو فیصد درست معلوم ہوتا ہے کہ ''وہ حق بات پر ڈٹ جاتے ہیں..... اُن کے نزدیک حق بات کہنا ہی زندگی کا حاصل ہے۔''(۴۲) بنگلہ دیش میں موجود 'آخرِ شب کے ہم سفر' بہاریوں کی تکلیفِ زار اور پاکستانیوں کی بے حسی پر بھی مسلم صاحب آئینہ دکھانے سے باز نہیں رہ پاتے:

''کیا پاکستان اتنا ہی مفلس، کنگال اور غریب ہے کہ ڈھائی لاکھ پاکستانیوں کے لیے اِس کی زمین تنگ ہے، کیا چودہ کروڑ پاکستانیوں کے سینے اتنے تنگ ہیں، جن میں یہ برادرانِ خستہ گانِ راہ نہیں سما سکتے۔''(۴۳)

'کشورِ کسریٰ تا سونار دیس' روایتی سفر ناموں سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ اِس میں غیر ضروری تفصیلات اور مصنوعی رنگ آمیزی سے گریز کیا گیا ہے۔ مسلم صاحب کا تاریخی شعور، تہذیبی جڑوں کو کھنگالنے کی متجسس طبیعت، غیر معمولی سنجیدگی، احیائے ملت کی شدید تڑپ، پاکستان کا نظریاتی دفاع اور وطنِ عزیز کے استحکام کے لیے فراہم کیے گئے مفید مشورے اور سلجھا ہوا شگفتہ اسلوب..... جیسے عناصر اِس سفر نامے کو چیزے دگر بنا دیتے ہیں۔ ممکن ہے روایتی سفر ناموں کے تربیت یافتہ اذواق کو بھیگتی آنکھوں، پھیلتے کاجل، ٹوٹتی اُمیدوں، تجدید ملاقات کے وعدوں، عاشقانہ بے نیازیوں جیسی رنگین فضا اور غیر ملکی حسیناؤں کی عدم موجودگی کھٹکی ہو، تاہم مسلم صاحب تخیلاتی اور رومانوی دنیاؤں کی بجائے احوالِ واقعی کے بیان پر یقین رکھتے ہیں۔ اِس حوالے سے امجد اسلام امجد کی یہ رائے بھی حقیقت پر مبنی ہے:

''ع س مسلم کی فن کارانہ دیانت داری ہے کہ انہوں نے اپنی طرف سے مصالحہ ڈال کر بیان میں کہیں ایسی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جو اس کے متن میں پہلے سے موجود نہیں تھی۔''(۴۴)

ع س مسلم کے سفر ناموں میں گہری فکریت اور سوچ بچار کا پہلو سفر کے دوش بدوش رہتا ہے تاہم وہ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ وہ اگرچہ دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت تیرنا پسند کرتے ہیں۔ تاہم ان کے فکری سانچے میں مضبوط دلیل کے رُخ مڑنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ ''وہ ذہنی طور پر اصلاح پسند ہیں''۔(۵۲) تاہم اُن کی اصلاح پسندی تعصّبات سے بالاتر ہے۔ وہ آئینِ نو کو طرزِ کہن سے جدا نہیں سمجھتے بلکہ قدیم کو جدید تاویلات کے تحت تعبیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور تعبیر کے اس عمل میں وہ بیک وقت 'چشمِ ظاہر بیں'، 'چشمِ تصور' اور 'کیفیتِ قلب' کے امتزاجی اظہار کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور یہی اُن کے اس سفر نامے اور دوسری تصانیف کی نمایاں خوبی بھی ہے:

''چشمِ ظاہر بیں نے کیا دیکھا، چشمِ تصور نے اس کی کیا توجیہہ کی، قلب پر کیا گزری، ذہن نے کیا سوچا اور میرے نطق نے اس کی کیا تعبیر کی، شاید قاری کو بھی اس کا عکس ان سفر ناموں میں نظر آئے۔''(۶۲)

مسلم صاحب کی تقریباً ہر تصنیف کا آغاز حمد و نعت سے ہوتا ہے۔ اُردو کی قدیم اصنافِ ادب بالخصوص منظوم داستانوں میں یہ قرینہ

رائج رہا ہے تاہم ع س مسلم کے ہاں یہ اہتمام رسمی اور روایتی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ حمد و نعت کے معروف شاعر ہیں اور میزبانِ رسولؐ، حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزارِ اقدس کی زیارت کے دوران جاگتی آنکھوں جو روحانی تجربہ اور 'حیات بخش لمحہ' انہیں میسر آیا وہ مکمل طور پر اُن کی ماہیت قلبی کا باعث بن گیا۔ (۷۲) اب عشقِ رسولؐ اُن کے افکار کا محور و مرکز ٹھہرا اور اُن کی تصانیف اسی نور سے اخذ معانی کرنے لگیں۔ زیرِ مطالعہ سفر نامے میں بھی 'حرفِ دُعا' (مناجات) اور نعت کی شمولیت اسی پس منظر میں دیکھے جانے کا تقاضا کرتی ہیں۔

حوالہ جات/حواشی

۱- ذوقی، سید محمد، 'سرِ دلبراں'، الفیصل، اُردو بازار، لاہور، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص ۵۴۲

۲- ع س مسلم کی خودنوشت کا عنوان

۳- ''میں نے بعض اوقات لوگوں کے بوٹ پالش کر کے یا پھٹے پرانے کپڑوں سے رومال نکال کر اور ہاتھ سے سی کر، اسی نوع کی دوسری خدمات انجام دے کر کسی نہ کسی طرح میٹرک پاس کیا۔'' بحوالہ مصاحبہ، ع س مسلم، مصاحبہ نگار: ڈاکٹر طاہر تونسوی، مشمولہ ''جہت ساز تخلیقی شخصیت''، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۰۸

۴- مسلم، ع س، ''لمحہ بہ لمحہ زندگی''، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۰۲

۵- نیاز، ع س مسلم کے ذہنی طور پر پس ماندہ صاحب زادے ہیں۔

۶- Socity for Children in need of special attention

۷- طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ''جہت ساز تخلیقی شخصیت''، ص ۹

۸- ع س مسلم کی پہلی تصنیف اُن کا افسانوی مجموعہ 'ایک ٹہنی کا پھول' ہے جو ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔

۹- طاہر تونسوی، ڈاکٹر، ''جہت ساز تخلیقی شخصیت''، ص ۱۷

۱۰- تفصیل کے لیے دیکھیے: ع س مسلم کی خودنوشت ''لمحہ بہ لمحہ زندگی'' کا باب 'نئی منزلوں کی تلاش'، ص ۲۳۲ تا ۲۲۳

۱۱- کاروانِ حرم (۱۹۸۷ء)، کشورِ کسریٰ تا سوناردیس (۲۰۰۰ء)، سفر اندر سفر (۲۰۰۴ء)، سفر نامہ محبوبیہ (۲۰۰۴ء)

۲۱- مسلم، ع س، ''کشورِ کسریٰ تا سوناردیس''، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۸۲

۳۱- ایضاً، ص ۷۲

۴۱- ایضاً، ص ۵۵

۵۱- ایضاً، ص ۵۴

۶۱- ایضاً، ص ۶۷

۷۱- ایضاً، ص ۰۰۱

۸۱- ع س مسلم جنوری ۱۹۵۳ء میں پہلی مرتبہ 'مشرقی پاکستان' گئے۔

۹۱- ایضاً،ص۸۹۱

۲۰- ایضاً،ص۲۲۱

۱۲- ایضاً،ص۰۴۱

۲۲- عبدالستار نیازی،ڈاکٹر،"حسنِ گفتگو"،القمر انٹر پرائزز،لاہور،۲۰۰۴ء،ص۴۱

۳۲- بحوالہ کتاب "کشورِ کسریٰ تا سونا دیس"،ص۳۶۱

۴۲- امجد اسلام امجد،بحوالہ مضمون "ع س مسلم کی سفر کہانی"،مشمولہ کتاب "کشورِ کسریٰ تا سونا دیس"،ص۸۱

۵۲- خالد اقبال یاسر،بحوالہ مضمون "میرا اور ع س مسلم کا سونا دیس"،مشمولہ "کوزہ گرِ جہانِ فن"،القمر انٹر پرائزز،لاہور،۲۰۰۳ء،ص۳۷۱

۶۲- مسلم،ع س،"کشورِ کسریٰ تا سونا دیس"،ص۴۱

۷۲- تفصیل کے لیے دیکھیے:ع س مسلم کی تصنیف "سفرنامہ محبوبیہ" کا ضمنی باب "کیا مدہوشی،کیا سرشاری،کیا بیداری؟"،القمر انٹر پرائزز،لاہور،۲۰۰۵ء،ص۲۵

("ابوالامتیاز ع ۔س مسلم سیمینار"،منعقدہ ۷۔مارچ ۲۰۱۰ء،بہ اہتمام عالمی رابطہ ادبِ اسلامی،لاہور میں پڑھا گیا)

پروفیسر ڈاکٹر مختار ظفر

ع س مسلم کی تخلیقاتِ حمد و نعت

Abstract:
Abdul Statteer (A.S) Muslim is a great creative personality. He has, compiled so many creative works, that he can be called an institution, in his self. He has, compiled ten books on ... Hamd-o-Na,t (The Praiz of Allah and his prophet Peace be upon him), two on general poetry, three on the accaints of journey, one on short stories, four on criticism, eight on research articles, one on autobiography, one on interview, two on sociology, and ten on the children literature. So he is a great man of letter having more then thirty books on different subjects. The article consist of some detail, especially about his Hamdiya and Na,tia Poetry, i.e, the prais of Allah , and his messanger (Peace be upon him)

عبدالستار مسلم مہادرجے کی تخلیقی شخصیت ہیں۔ وہ اپنے نام سے پہلے "ابوالامتیاز" کی جو کنیت استعمال کرتے ہیں اس کا حق بھی ادا کررہے ہیں۔ انہوں نے تخلیقی اور تحریری سطح پر اتنی متعدد اور متنوع نگارشات پیش کی ہیں کہ انہیں اپنی ذات میں انجمن کہنا درست ہوگا۔ حمد و نعت کی دس، نظم، غزل، دوہے، گیت کی تین، تین سفرنامے، ایک افسانے کی، چار تحقیق و تنقید کی، مقالات و مضامین کی سات، ایک خودنوشت، ایک انٹرویوز کی، دو سماجیات کے موضوع پر اور دس پاکستانی بچوں کے لیے شعری و نثری تخلیقات اور تصانیف پیش کی ہیں۔ دو مزید زیرِ ترتیب ہیں۔ عربی زبان میں تحقیق و ترجمہ و مقالات پر مشتمل آٹھ کاوشیں الگ ہیں۔

ان کی شخصیت، فن اور فکر پر مبنی گیارہ کتابیں علمی و ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں ایک پنجابی زبان میں ڈاکٹر ریاض مجید، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور ڈاکٹر امجد علی بھٹی کی مرتب کردہ ہے۔ ایک ڈاکٹر طاہر تونسوی کی "جہت ساز تخلیقی شخصیت۔ ع س مسلم" کے عنوان سے ہے۔ ایک کتاب "ابوالامتیاز ع س مسلم۔ شخصیت اور فن" کے نام سے اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کی طالبہ شازیہ نورین کے ایم اے کے مقالے پر مبنی ہے۔ پروفیسر حسین سحر بھی ان کی حمدیہ و نعتیہ شاعری پر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں۔ انڈیا کی دو نو بھاوے یونیورسٹی میں بھی ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا گیا ہے۔ اپنے فکری و شعری افکار کے لیے انہوں نے اردو، پنجابی، انگریزی اور عربی زبانوں کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ آپ کی تخلیقی اور تصنیفی کاوشوں نے گیارہ اعزازات بھی حاصل کیے ہیں۔ اس پائے کی علمی و تخلیقی شخصیت کو ابوالامتیاز کہنا بھی روا ہے اور اپنی ذات میں انجمن کہنا بھی حقِ عین ہے۔

آپ کی متذکرہ قلمی و شعری نگارشات کے دھنک رنگوں میں، جس موضوع کو سب سے زیادہ FOCUS کیا گیا ہے وہ حمد و نعت ہے۔ کیا یہ خود اختیاری عمل ہے؟ یا شعوری کاوش یا جذبۂ بے اختیار کی موجِ طوفاں بدست؟ مگر یہ تو معاملات حسن و عشق ہیں پھر کیسی خود اختیاری اور کیسا شعوری عمل؟ حسنِ بے مثال کی فرماں روائی میں عشق کے حواس کہاں قائم رہتے ہیں۔ یہاں تو پا بجولاں بھی، برہنہ پا بھی اور پا پیادہ بھی، مگر افتاں و خیزاں، کشاں کشاں اور رقصاں رقصاں بارگاہ میں حاضر ہونا پڑتا ہے اور کیفیت یہ ہوتی ہے جو غالب نے بتائی:

وہی صد رنگ نالہ فرسائی وہی صد گونہ بے قراری

ابوالامتیاز کی ایسی ہی کیفیت نے انہیں حمد ونعت میں اس قدر طبع آزمائی کے لیے تحرک دیا۔

ہماری حمدیہ ونعتیہ شاعری میں اعلیٰ پائے کی تخلیقات ملتی ہیں تاہم نعت گوئی کا رجحان زیادہ ہے بلکہ اس حوالے سے شعراء کی جذباتی جولانیاں نئے نئے گل وگلزار پیدا کررہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں تحمید وتمجیدِ الٰہی کی نغمگی کم ہے جس کی دو وجوہ ہوسکتی ہیں: ایک یہ کہ ممکن ہے شعوری یا لاشعوری طور پر شعراء کے ذہنی پس منظر میں قرآنِ حکیم کی یہ آیت اور اس کا تاثر کارفرما ہو:

"قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ -(۳: ۳۱): یعنی (اے پیغمبر) کہہ دیجیے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہوتو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا"۔

یوں ہمارے نعت گوشعراء آپؐ کے توسل سے خدائے عزوجل کی محبتوں، رحمتوں اور عنایتوں کا رُخ اپنی طرف موڑنا چاہتے ہیں۔

ثانیاً: حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعزاز کہ "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ " مِّثْلُكُمْ یُوْحٰٓی اِلَیَّ (۱۸: ۱۱۰): آپ کہہ دیجیے میں بھی تمہارے جیسا آدمی ہوں (ہاں) مجھے وحی آتی ہے"۔

چنانچہ بشریت سے قدرتی تعلق کی بناء پر محبت کے جذبات فطرتاً موجزن ہوتے ہیں۔ بعینہٖ جس طرح غزلیہ شاعری میں صوفیانہ مضامین باندھتے وقت محبوب حقیقی کو مجاز کے پردے میں پیش کیا جاتا ہے اور یوں مجاز سے حقیقت تک رسائی کے لیے عشقیہ سفر کیا جاتا ہے، نیز بشریت سے فطری اُنسیت اور اس کے فکروعمل اور حسن وجمال کے قریبی مشاہدات کی مقرونیت کی بناء پر محسوسات اور جذبات فطری طور پر متحرک ہوجاتے ہیں۔ یہی محرکات نعت گوئی کے پس پردہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں خالقِ کائنات کی صفاتِ عالیہ کی ماورائیت اور اس کی ربوبیت اور کرم فرمائیوں کی وسعتِ بے کنار میں کھو کر انسان کو جس حیرت اور استعجاب سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور پھر اس سے کم مائیگی کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے، اس وجہ سے توصیفِ الٰہی میں شعراء کے تخیل کی جولانیاں کم رو رہتی ہیں اور انہیں ع س مسلم کی زبان میں یوں پکارنا پڑتا ہے:

عبث ہے عبث، زعم حمد و ثناء
ھُوَ اللّٰہُ قدُّوسٌ و ربُّ الْعُلیٰ (کاروانِ حرم)

کس زباں سے حمدِ باری ہو ادا
وہ تو ہے لفظ و بیاں سے ماورا (زمزمہ ' درود)

جناب ابوالامتیاز نے اردو ادب کی اس روایت سے ہٹ کر حمد ونعت میں توازن کا التزام کرکے اپنا امتیاز قائم رکھا ہے۔ ان کی پہلی حمد اپریل ۱۹۸۰ء میں تخلیق ہوئی۔ پہلی نعت جولائی ۱۹۸۱ء میں منصۂ شہود پر آئی اور پہلا سلام نومبر ۱۹۸۱ء میں پھر